ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۲/۲۹، جولائی - دسمبر ۲۰۱۴ء

مکالمہ ومباحثہ کے آداب قرآنی قصوں کی روشنی میں

قصۂ نوحؑ کے حوالہ سے

عودة عبد عودة عبداللہ

ترجمہ: محمد اسماعیل اصلاحی

قرآن کریم نے جن مسائل کی طرف ہماری توجہ خاص طور سے مبذول کرائی ہے ان میں سے ایک اہم مسئلہ ''حوار'' یعنی باہم گفتگو اور مباحثہ کا ہے۔ ''حوار'' عربی زبان کی ایک معروف رائج الوقت اصطلاح ہے جس کا قرآن مجید میں اس طور پر استعمال نہیں ملتا۔ لیکن قرآن مجید نے گفتگو کے طور طریق واضح کیے ہیں، اس لیے کہ گفتگو انسان کے باہمی تعلقات کی استواری کا ایک اہم ذریعہ ہے اور اسی کے توسط سے انسان ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے، لہٰذا قرآن کریم میں اس کے اصول و آداب بیان کرنا ایک فطری بات تھی۔ درحقیقت قرآن خود ایک کلام ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ اس کی اپنی اثر انگیزی کی وجہ سے ہے۔ اسلام میں گفتگو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ افہام وتفہیم کا مذہب ہے جو گفتگو یا مکالمہ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس مذہب میں درپیش مسائل میں بات چیت اور بحث و مباحثہ کا میدان کھلا رہتا ہے تاکہ لوگ دلائل و براہین کی بنیاد پر اس کے بارے میں باہم گفتگو کر سکیں اور خوش اسلوبی سے بحث و مباحثہ کر کے حقائق تک پہنچ جائیں۔ اس مقالہ میں گفتگو و مباحثہ کے ان اصول و اسالیب سے بحث کی جائے گی جو قرآنی قصص میں وارد ہیں، تاکہ ان کی تفہیم کے ساتھ اس تعلق سے قرآن کے فنی محاسن کا بھی ادراک کیا جا سکے اور گفتگو سے متعلق قرآنی احکام کی وضاحت ہو سکے۔ درحقیقت

مباحثہ کے اصول و آداب سے واقفیت ہر دور اور ہر خطہ کے داعی کے لیے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔

آدابِ گفتگو کی اہمیت

مکالمہ (حوار) دراصل طرفین کے درمیان ہونے والی گفت وشنید کو کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک اپنا مدعا بیان کرتا ہے تو دوسرا اس پر اپنی رائے دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرتا ہے[1]۔

گفتگو انسان کی وہ صفت ہے جس کا تعلق عقل وفہم اور الہام سے ہے۔ انسان کے دل میں کوئی بات کھٹکتی ہے تو وہ اس پر غور وفکر کرتا ہے اور کسی خاص بات پر اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد اپنی رائے پوری وضاحت اور مضبوطی کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ مگر جب کوئی شخص اس کی رائے سے اختلاف ظاہر کرتا ہے تو وہ اپنے افکار و خیالات مجتمع کر کے گفتگو اور مباحثہ کا وہ طریقہ اختیار کرتا ہے جس سے دل و دماغ میں بات آسانی سے اترتی چلی جاتی ہے اور پھر یہ آخر کار معلومات میں اضافہ کا ذریعہ بنتی ہے اور بحث و تحقیق کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

بحث و مباحثہ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاً — انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

(الکہف ۵۴/۱۸)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ وہ اپنی عقل وفہم کے ذریعہ پیش آنے والے حالات ومسائل کا مقابلہ کرتا رہتا ہے، کسی ایک حالت پر ساکن نہیں رہتا بلکہ وہ ایک چیز کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں تفتیش وتحقیق کرتا ہے اور اس کے مالہ وماعلیہ پر بحث ومباحثہ کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ درپیش معاملہ میں اس کے شکوک وشبہات دور ہو جائیں اور اسے اطمینان یا یقین نصیب ہو جائے۔

زندگی کے مختلف مراحل میں طرح طرح کے حالات و واقعات کے پیش آنے

کے نتیجہ میں انسان کے افکار و خیالات بدلتے رہتے ہیں وہ کبھی ایک رائے کو اختیار کرتا ہے تو کبھی دوسری۔ اس طرح اس کی فکری قوتیں پروان چڑھتی ہیں اور متبعین کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ ان تمام باتوں کے طفیل میں مباحثہ کا عمل فروغ پاتا ہے جو اپنی رائے کی حمایت حاصل کرنے کے لیے یا فکری و نظریاتی معرکہ میں ہزیمت سے نبرد آزما ہونے کے لیے معاون بنتا ہے۔

مباحثہ کا اصل مقصد دوسرے کو اپنی رائے کا قائل کرنا یا اسے اپنا ہم نوا بنانا ہوتا ہے۲۔ اس سے ثابت ہوا کہ مباحثہ ایک علمی مقابلہ آرائی یا جنگ ہے جس کا اصل ہتھیار کلام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے گفتگو یا بات چیت پر بہت زور دیا ہے۔ یہاں اس جانب اشارہ مناسب ہوگا کہ مباحثہ کی اہمیت دراصل اندازِ کلام پر منحصر ہے۔ اور یہ وہ ہتھیار ہے جسے ہر نبی نے اپنے اپنے دور میں دعوت و تبلیغ کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری یا ان کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچائیں اور انھیں جہالت و گمرہی سے نکال کر اللہ کی صحیح معرفت سے روشناس کرائیں۔ پھر انھیں موثر انداز میں شریعت الٰہی کے نفاذ کی طرف متوجہ کریں اور اس کام میں وہ لوگوں کے مزاج کو پیش نظر رکھیں جو انبیاء اور ان کے متبعین کے درمیان مسلسل و مستقل مباحثہ کے لیے ضروری ہے اس لیے کہ ہر زمانہ میں رسول کا اصل منشاء یہ رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی دعوت سے مطمئن کرے اور انھیں اپنا ہم نوا بنائے جب کہ ان کی قوم کے لوگ اپنی دیرینہ روایات اور قدیم خاندانی رسوم کو باقی رکھنے کے لیے بحث و جدال کا سہارا لیتے تھے تو اس معرکہ آرائی یا بحث و مباحثہ کے ماحول میں ایک بنیادی ہتھیار کی حیثیت سے گفتگو کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ تمام عسکری اسلحہ جات میں بعض کی غرض بعض سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن کلام ایسا ہتھیار ہے جس کا کوئی متبادل نہیں اور جس سے کوئی داعی و مبلغ بے نیاز نہیں رہ سکتا ہے۳۔ اسی لیے حضرت موسیٰ نے قوت گویائی کو اپنی بنیادی ضرورت قرار دی اور اپنے رب سے اس کی توفیق کے لیے دعا فرمائی:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ. وَیَسِّرْ لِیْ أَمْرِیْ. وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ. یَفْقَهُوا قَوْلِیْ (طٰہٰ ۲۰/۲۵-۲۸)

اس نے دعا کی کہ اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لیے کھول دے اور میری فہم کو آسان کر اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات سمجھیں۔

یہاں یہ بھی قابل غور ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے لیے شرح صدر کی دعا کے ساتھ یہ تمنا بھی کی: یفقھوا قولی (تا کہ لوگ میری بات سمجھ جائیں)۔ یہ دراصل پورے معاملہ کا نچوڑ ہے، اس لیے کہ جب لوگ بات ہی نہیں سمجھیں گے تو ان تک پیغام کی ترسیل کیسے ہوگی اور ان سے رابطہ کیسے قائم ہوگا۔

اسی لیے حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے کسی قسم کے اسلحہ اور زور بازو کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ انھوں نے صرف ایسی قوتِ گفتار عطا کرنے کی التجا کی جس کے ذریعہ مدعا واضح کیا جا سکے۔ اور چونکہ وہ خود فصیح اللسان نہیں تھے اس لیے انھوں نے اپنے بھائی ہارون جو کہ فصیح اللسان تھے ان کی رفاقت یا معاونت اللہ رب العزت سے طلب کی۔

وَأَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْ إِنِّیْ أَخَافُ أَنْ یُّكَذِّبُوْنِ (القصص ۲۸/۳۴)

اور میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں تو ان کو بھی میرے ساتھ مددگار کی حیثیت سے بھیج کہ وہ میری تائید کریں میں ڈرتا ہوں کہ وہ لوگ مجھے جھٹلا دیں گے۔

قوتِ گفتار اور فصیح و بلیغ اسلوب بیان ہی وہ ہتھیار تھے جن کے بل بوتے بر حضرت موسیٰ نے تبلیغ کا بیڑا اٹھایا اور یہی وہ اسلحے ہیں جن کی ضرورت ہر زمانے کے داعی کو دنیا کے ہر خطے میں ہوتی ہے[۴]۔

علامہ قرطبیؒ نے مباحثہ کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بیان کیا کہ مدمقابل کو لاجواب کر دینے اور حق و باطل کو دلائل و براہین کی روشنی میں بے نقاب کر دینے کے لیے جو وسیلہ استعمال کیا جاتا ہے وہ ''حوار'' یعنی مباحثہ ہے۔ جیسا کہ آیت مجادلہ کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں:

"ذلک من الآی فھو کله تعلیم من اللہ عز وجل السوال والحوار والمجادلة فی الدین، لانه لا یظهر الفرق بین الحق والباطل الا بظهور حجة الحق ورفض حجة الباطل"۵۔

یہ پوری آیت دین سے متعلق استفسار اور مکالمہ و مباحثہ کے باب میں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اصول و آداب ہیں۔ اس لیے کہ حق و باطل کے درمیان فرق اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتا ہے جب تک حق کو دلیل کے ذریعہ ثابت نہ کردیا جائے اور باطل کو دلیل کے ذریعہ رد نہ کردیا جائے۔

مذکورہ آیت سے بھی قرآن کی نظر میں مباحثہ یا بات کو مدلل و موثر انداز میں پیش کرنے کی اہمیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے صرف دشمنوں کے خیالات کی تردید کرنے اور مخالفین کو قائل کرنے کے لیے ہی مباحثہ پر نہیں ابھارا ہے بلکہ بہت سے مقامات پر تعلیم و تربیت کے تعلق سے مباحثہ کی مثالیں بھی پیش کی، مثلاً حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ اور اسی طرح حضرت مریمؑ اور ان کے شیر خوار صاحب زادہ کے مابین مکالمہ میں تعلیم و تربیت کا پہلو غالب ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ قرآن مجید نے مباحثہ کو اہمیت اس وجہ سے بھی دی ہے کہ مدلل گفتگو سے ہی مخاطب کو مطمئن کیا جاسکتا ہے اور اطمینان پر ہی ایمان و یقین کی بنیاد ہے۔ اس کے سوا ایمان کچھ بھی نہیں۔ خواہ کوئی بھی مذہب ہو اس کے اصول و نظریات سے مطمئن ہونے کے بعد ہی ایک شخص اسے قبول کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مذہب اور اس کی صداقت کی دلیل پیش کرنے کے لیے مباحثہ کی بہت اہمیت ہے۶۔

مباحثہ کے آداب

جب بھی ہم مباحثہ کریں تو لب و لہجہ نرم و شیریں ہو اور لغو باتوں سے پرہیز کریں۔ گفتگو میں ادب و احترام کا پہلو ملحوظ رکھا جائے۔ مباحثہ کے اہم آداب و اصول

ذیل کے سطور میں بیان کیے جارہے ہیں:

حسنِ کلام اور خوشگوار گفتگو

متکلم کی صفت کلام ہے اور کلام جتنا ہی ادب واخلاق کے دائرے میں ہوگا اتنا ہی بامقصد وموثر ہوگا۔ اور کلام زبان وبیان کی خوبیوں کے اکتساب کا ایک نظام ہے جو شخص اس میں جتنا ماہر ہوگا وہ اتنا ہی دوسروں پر اثر انداز ہوگا۔

مباحثہ کا اولین مقصد بہتر اسلوب میں مدعا کی وضاحت ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل پانچ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ہے۔

١- گفتگو برمحل اور موضوع سے متعلق ہو۔

٢- عام فہم ہو، کسی پڑھے لکھے انسان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ عوام کی سطح سے اوپر اٹھ کر بات کرے۔

٣- افکار وخیالات کی وضاحت عمدہ اسلوب میں کی جائے۔

٤- لہجہ پُر اعتماد اور تعبیر میں ادبی چاشنی لیے ہوئے ہوں۔

٥- کلام میں ایجاز ہو، اس لیے کہ تکرار سے کلام کا حسن زائل ہوجاتا ہے اور سماعت پر گراں گزرتا ہے۔ مگر اس قدر مختصر بھی نہ ہو کہ مفہوم ہی ادا نہ ہوسکے۔

قرآن کریم نے مکالمہ میں اچھا اسلوب اختیار کرنے کی ترغیب دی اور بہت سے مقامات پر خود حسنِ کلام اور بہترین طرز ادا کی مثال پیش کی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ. تُؤْتِيْ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ. وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ اجْتُثَّتْ

کیا تم نے غور نہیں کیا، کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرۂ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔ اور اللہ

مِن فَوْقِ الأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ. يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُواْ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِيْ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِيْ الآخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ۔
(ابراہیم ۱۴/۲۴-۲۷)

لوگوں کے لیے تمثیلیں بیان کرتا ہے تا کہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔ اور کلمہ خبیثہ کی تمثیل ایک شجرہ خبیثہ کی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ لیا جائے۔ اسے ذرا ثبات حاصل نہ ہو۔ اللہ اہل ایمان کو قول محکم کی بدولت دنیا کی زندگی میں بھی ثبات عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائیگاں کردے گا۔ اور اللہ جو چاہے کرتا ہے۔

خراب باتیں تو دلوں کو توڑنے اور تفریق پیدا کرنے والی ہوتی ہیں جس سے سماج کی بنیادیں پوری طرح منہدم ہوجاتی ہیں۔ اس کے بالمقابل اچھی باتیں دلوں میں چمک پیدا کرتی ہیں جس سے خیر و بھلائی اور الفت ومحبت کے پھول کھلتے ہیں۔ اس کی خوشبو ہر جگہ پھیلتی رہے، جب کہ کلمہ خبیثہ ایسی بدبو ہے جو انتہائی غلیظ جگہ سے اٹھتی ہے۸۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَقُل لِّعِبَادِيْ يَقُولُواْ الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنزَغُ بَيْنَهُمْ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلإِنْسَانِ عَدُوّاً مُّبِيْناً
(بنی اسرائیل ۱۷/۵۳)

اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے اندر وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے ہی۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَقُولُواْ لِلنَّاسِ حُسْناً (البقرۃ ۲/۸۳)

اور لوگوں سے اچھی بات کہو

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"یامر تبارک تعالیٰ عبده ورسوله ﷺ. ان یامر عباد الله المومنین ان یقولوا فی مخاطبتهم ومحاورتهم

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ وہ اللہ کے مومن بندوں کو حکم دیں کہ وہ اپنی گفتگو میں کلام احسن اور خوشگوار جملہ استعمال کریں۔ اگر

الکلام الا حسن والکلمة الطیبة. فانهم ان لم یفعلوا ذالک. نزغ الشیطان بینهم، واخرج الکلام الی الفعال ووقع الشر والمخاصمة والمقاتلة، فانه عدو آدم وذریته، من حین امتنع من السجود لآدم، وعداوته ظاهرة بینة"۹۔	وہ ایسا نہیں کریں گے تو شیطان ان کو ایک دوسرے کے خلاف اکسائے گا۔ اس طرح ان کے درمیان فساد اور لڑائی جھگڑا ہو جائے گا، کیوں کہ شیطان آدم اور ابن آدم کا اسی دن سے دشمن ہے جس دن سے اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اس کی کھلی دشمنی بالکل کھلی ہوئی ہے۔

یہ آیت مباحثہ کے اس بنیادی ادب کی طرف رہنمائی کرتی ہے جس سے ایک دوسرے کے درمیان تعلقات میں بہتری آتی ہے۔ جس طرح اچھی گفتگو تعلقات کی استواری میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح انسانی مسائل کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ کیوں کہ لفظی ومعنوی ہر اعتبار سے قولِ حسن دلوں کو کھولتا ہے اور روح کو تازگی بخشا ہے اور لوگوں کے درمیان تعلقات کو مضبوط بناتا ہے۔۱۰

مکالمہ ومباحثہ میں دلچسپی رکھنے والے اسلام اور اس کے لطائف کا علم رکھنے والوں کی تحریروں میں مباحثے کے آداب ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اس کی بہترین مثالوں سے ہمارا علمی سرمایہ بھرا پڑا ہے۔ جن میں سے ہم صرف دو مثالیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہ خط کی صورت میں ہیں جو ہماری امت کے دو عظیم علماء دین کے ہیں: ایک امام مالک بن انسؒ امامِ دارالہجرہ اور دوسرے مصر کے ممتاز عالم لیث بن سعدؒ ہیں۔ گرچہ یہ خطوط احکام و مسائل سے متعلق ہیں تاہم اس میں حسنِ کلام کے عمدہ نمونے موجود ہیں جن کی آج ہمیں سخت ضرورت ہے۔ امام مالکؒ تحریر فرماتے ہیں:

واعلم - رحمک الله، بلغنی انک تفتي الناس بأشیاء مختلفة لما علیه الناس عندنا وببلدنا الذی نحن فیه، وانت في امانتک وفضلک ومنزلتک من اهل بلدک	اللہ تم پر رحم فرمائے، مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے فتوے مختلف معاملات میں ہمارے فتوے کے خلاف ہوتے ہیں۔ آپ اپنے لوگوں میں امانت دار، صاحب فضل ومرتبہ ہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے نفس کے

وحاجة من قبلك اليك، حقيق بان تخاف على نفسك، فانظر رحمك الله فيما كتبت لك، واعلم أني أرجو ان لا يكون قد دعاني الىٰ ما كتبت به اليك الا النصيحة لله وحده والنظر لك فانزل كتابي منزلته، فانك تعلم انی لم آلک نصحاً۔

بارے میں غور فرمائیں اور جان لیں کہ مجھے اس کام کے لیے صرف اور صرف اللہ کے لیے نصیحت اور آپ کی خیر خواہی نے دعوت دی ہے تو آپ میرے خط کو نصیحت کا مقام دیں اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ میں نصیحت کرنے میں کوتاہی (لاپرواہی) نہیں کرتا۔

امام لیث ان باتوں کا جواب کتنے اچھے انداز میں دیتے ہیں، ملاحظہ ہو:

وقد اصبت بالذی کتبت به من ذلک، ووقع منی بالمواقع الذی تحب ... ثم قال: وقد بلغنا عنکم شئ من الفتيا، وقد كنت كتبت اليک فی بعضها فلم تجبنی، فتخوفت ان تكون استثقلت ذلک فترکت الكتاب اليک فی شئ مما انکرت ... ثم يبين الامام الليث انه ثابت على رايه مخالف فی ذلک رای الامام مالک فی العديد من المسائل والآراء دون مجاملة او مداراة على حساب الحق، ثم يختم كتابه بقوله: وأنا احب توفيق الله اياک وطول بقائک، لما أرجو للناس فی ذلک من المنفعة، وان نأت الدار فهذه

آپ تو یہ خط لکھ کر کامیاب ہو گئے۔ آپ کی محبت میرے دل میں بیٹھ گئی۔ آگے لکھتے ہیں: آپ کے کچھ فتوے مجھے معلوم ہوئے تو ان کے بارے میں تحریری طور پر آپ سے معلوم کرنا چاہا مگر آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ پر یہ بات گراں گزری ہے اس وجہ سے اس سلسلے میں آپ سے دریافت کرنا چھوڑ دیا جو آپ کو ناپسند ہیں۔ اس کے بعد امام لیث وضاحت کرتے ہیں کہ وہ متعدد مسائل میں اپنی رائے پر قایم رہتے ہیں گرچہ وہ امام مالک کی رائے کے مخالف ہوتی ہے وہ اس باب میں حق کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ پھر اپنی بات یہ کہہ کر ختم کرتے ہیں۔ میں اللہ سے

منزلتک عندی ورأیک فیہ فاستیقنہ، ولا تترک الکتابۃ الی بخبرک وحالک وحال ولدک واھلک وحاجۃ ان کانت لک او لاحد یوصل بک فانی أسرّ بذلک۔ ۱۱

آپ کے لیے توفیق بخشی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں کیوں کہ مجھے امید ہے کہ آپ کی ذات سے لوگوں کو بڑا فائدہ ہوگا۔ گرچہ ہمارے گھر دور ہیں، میرے نزدیک آپ کا وہی مقام ومرتبہ ہے اس پر آپ یقین رکھیں۔ آپ اپنے والد اور اہل وعیال کے احوال اور اپنی وقریبی لوگوں کی ضروریات سے مطلع کرتے رہیں مجھے اس سے خوشی ہوگی۔

مکالمہ ومباحثہ کے یہ بہترین نمونے لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اسلامی آداب گفتگو ملحوظ رکھیں بجائے اس کے کہ کچھ لوگ ملت کے ناصح اور لوگوں کے افکار وخیالات کے ذمہ دار بن بیٹھے ہیں اور وہ کسی کو متہم کرتے ہیں تو کسی کو فاسق وفاجر قرار دیتے ہیں اور افکار وخیالات کے اظہار سے خوف دلاتے ہیں تاکہ علماء لوگوں کے مسائل کے بارے میں اجتہاد نہ کرسکیں۔ اس طرح گفتگو کے مناسب طریقوں اور بحث کے عمدہ اسلوب کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور تصادم وٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

خاموش رہ کر توجہ سے سننا

بسا اوقات کلام انسان پر آفتیں اور بلائیں لاتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے خاموشی (صمت) کی فضیلت واہمیت واضح کرتے ہوئے اسے اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خاموشی اکثر حالات میں گفتگو سے بہتر ہوتی ہے۔ جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ”من صمت نجا“ ۱۲ (جس نے خاموشی اختیار کی وہ کامیاب ہوا)۔ اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت ابودرداءؓ سے منقول ہے:

عن ابی درداء أنہ قال: انصف اذنیک من فمک فانما جعل لک اذنان اثنتان وفم واحد، فاسمع اکثر مما تقول ۱۳۔

حضرت ابودرداءؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: اپنے منھ کے مقابلے میں کانوں کے ساتھ انصاف کرو کیوں کہ کان دو اور منھ ایک اس لیے بنائے گئے کہ بولنے سے زیادہ سنو۔

امام شافعیؒ نے ان لوگوں کو بہت اچھا جواب دیا جو انھیں ہر کس و ناکس کے بحث و مباحثہ کے جواب میں خاموشی پر ملامت کرتے تھے۔

قالوا: سکتَّ وقد خوصمت قلت لهم ان الجواب لِباب الشر مفتاحُ

(لوگوں نے کہا: آپ خاموش ہیں حالاں کہ آپ سے مباحثہ کیا جا رہا ہے، میں نے ان سے کہا کہ جواب دینا یقیناً برائی کا دروازہ کھولنا ہے)

والصمت عن جاهل او احمق شرف وفيه ايضاً يصون العرض اصلاحُ

(جاہل اور بے وقوف کی بات سن کر خاموش رہنا شرف کی بات ہے، اس میں عزت و آبرو کی حفاظت ہے)

ماترى الاسد تخشى وهى صامتة؟ والكلب يُخسَى لعمرى وهو نبَّاحُ [۱۴]

(کیا نہیں دیکھا کہ شیر جب تک چپ ہوتا ہے اس وقت تک اس سے ڈرا جاتا ہے۔ اور کتا جب بھونکتا ہے تب لوگ اس سے ڈرتے ہیں)

مگر بلاوجہ خاموشی بھی مناسب نہیں اس لیے کہ بے مقصد خاموشی انتشارِ ذہن اور کاہلی کی دلیل ہے۔ حسنِ سماع کے لیے خاموشی کے ساتھ ساتھ ذہن و دماغ کی حاضری ضروری ہے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَإِذَا قُرِءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُواْ لَهُ وَأَنصِتُواْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف ۷/۲۰۴)	اور جب قرآن سنایا جائے تو اس کو توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

جب قرآن مجید پڑھا جائے تو صرف خاموش رہنا ہی کافی نہیں بلکہ خاموشی کے ساتھ ساتھ غور سے سننا بھی ضروری ہے یعنی قرآن پوری توجہ سے سن کر غور و فکر کرنا۔

مکالمہ و مباحثہ کے آداب میں حسنِ سماع بہت اہم ہے اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ کوئی بھی شخص فنِ کلام میں ماہر نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ وہ دھیان سے سننے میں مہارت نہ پیدا کرلے۔ قدماء میں سے کسی حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: اے پیارے بیٹے تم اچھی طرح سننا بھی سیکھو جس طرح اچھی طرح بات کرنا سیکھتے ہو[۱۵]۔

قرآن مجید نے بھی حسنِ سماع کی اہمیت وضرورت بیان کی ہے۔ ارشادالٰہی ہے:

اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ أُوْلَئِكَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللَّهُ وَأُوْلَئِكَ هُمْ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ (الزمر ۱۸/۳۹)	جو لوگ بات توجہ سے سنتے اور اس میں سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور یہی جو عقل والے ہیں۔

پوری توجہ اور غور سے سننا ایک تمرینی عمل ہے اس میں مزید مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ افراد اور جماعت کے درمیان تعلقات کی استواری کے سلسلے میں اس کی بڑی اہمیت ہے اور یہ لوگوں کی باتوں کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ساتھ ہی آلام و مصائب کو ختم کرنے اور مشکلات حل کرنے میں ممد و معاون ہے۔ ولیم اوری (William Ury) اپنی کتاب ''فن التفاوض'' میں لکھتے ہیں: خاموشی کے بڑے فوائد ہیں یہ دوسروں کے دلوں میں جھانکنے اور ان کے افکار وخیالات تک رسائی کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح دوسروں کو آپ کے لیے ہمہ تن گوش کردیتی ہے۔ اگر آپ مخاطب کے بارے میں جان جائیں کہ وہ کبیدہ خاطر یا ناراض ہے تو بھی اس کی شکایت پر دھیان دیں۔ آپ کو یہ محسوس ہوجائے کہ وہ نادانی اور بدتمیزی پر آمادہ ہوجائے گا تو بھی اس سے کنارہ کش نہ ہوں اور ممکن ہو تو اسے احساس دلائیں۔ آپ کی نگاہیں اس کے اوپر جمی ہوئی ہوں اور رہ رہ کر اپنا سر ہلائیں اور ہاں! ہاں! کہیں یا اسے بتائیں کہ میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔ اور جب وہ بات پوری کرلے تو بڑی ملائمت سے دریافت کریں کہ اور تو نہیں کچھ کہنا ہے یا یہ کہ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ یا یہ کہیں کہ اچھا! اس کے بعد کیا ہوا۔ اس طرح کے کلمات سے مخاطب کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ بجائے اس کے کہ بالکل خاموش رہیں، کیوں کہ یہ چیز اکثر غصہ والے کا غصہ ٹھنڈا کردیتی ہے جس سے اس کا ہوش ٹھکانے آجاتا ہے۔ پھر وہ مشکل کو حل کرنے اور مطلوبہ فیصلہ کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہتر گفتگو کرنے والے وہی ہوتے ہیں جو بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں[۱۶]۔

اس پہلو سے جب ہم رسول ﷺ کی حیات مبارکہ پر نظر ڈالتے ہیں تو حسنِ کلام

کے بہترین نمونے پاتے ہیں۔ جب بھی کوئی آپ ﷺ سے ہم کلام ہوتا تو آپ ﷺ پوری توجہ سے اس کی بات سنتے چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا خادم۔ یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ کو صحابہ کرامؓ کے درمیان عظمت و بلندی حاصل ہوگئی تھی۔ اس باب میں آپ ﷺ کا یہ طرزِ عمل نہ صرف اپنوں بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی تھا۔ آپ ﷺ ان کی باتیں بہت غور سے سنتے تھے جیسا کہ درج ذیل واقعات سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔

روایت ہے کہ ایک بار عتبہ بن ربیعہ آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اس نے آپ ﷺ سے کہا: اے بھتیجے! تم ہم میں سے ہو اور تم خاندان کی سیادت وقوت اور اس کے نسب کی بلندی سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم اپنی قوم کے سامنے ایک بہت اہم معاملہ لے کر آئے ہو۔ اس کے ذریعہ قوم کی جمعیت منتشر کر دیا، عقل مندوں کو بے وقوف ٹھہرایا، ان کے معبودوں کو برا بھلا کہا اور آباؤ اجداد کے طریقہ پر چلنے والوں کو کافر قرار دیا، مجھ سے سنو! میں تمہارے سامنے کچھ باتیں رکھتا ہوں شاید کہ تم اس میں سے کچھ کو قبول کرلو۔

یہ باتیں سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ابوالولید کہو میں سن رہا ہوں، عتبہ کو جو کچھ کہنا تھا اس نے کہا جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: کیا تم اپنی بات کہہ چکے۔ اس نے جواب دیا: ہاں! تب آپ ﷺ نے اس کے سامنے سورہ حمٓ السجدہ تلاوت کرنی شروع کردی جب آپ ﷺ آیت سجدہ پر پہونچے تو سجدہ تلاوت کر کے آپ ﷺ نے عتبہ سے کہا: اے ابوالولید تم سن چکے۔ اب تم ہو اور یہ کلام (یعنی غور کرو یہ کیا پیغام دے رہا ہے)۔ تو عتبہ وہاں سے اٹھ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ چہرے کے آثار کو دیکھ کر اس کے کچھ ساتھیوں نے کہا: واللہ! ابوالولید جس چہرے کو لے کر گئے تھے یہ وہ چہرہ نہیں ہے۔ عتبہ نے لوگوں کو بلایا کہ وہ رسول ﷺ کی دعوت اور آپ ﷺ سے جو گفتگو ہوئی ہے اس پر توجہ دیں تو ان لوگوں نے اس سے انکار کر دیا اور طعنہ دینے لگے کہ اے ابوالولید تم پر اس کی زبان کا جادو چل گیا ہے[1]۔

اس پورے مکالمہ میں آدابِ گفتگو پوری طرح نمایاں ہیں۔ یہ اس باب میں ہمارے لیے کافی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ابوالولید کی بات کو بغور سنا اور خلل

انداز نہیں ہوئے بلکہ اس کی بات پوری ہونے کے بعد اسے مزید کہنے کا موقع دیا کہ شاید کوئی بات چھوٹ گئی ہو یا بھول گیا ہو۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا بھی کہ "اے ابوالولید کیا تمہاری بات پوری ہوگئی؟ یہ آپ ﷺ کا اعلیٰ اخلاق اور عمدہ ادب ہے جس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مخاطب کی بات پوری توجہ سے سنی جائے۔

حُسنِ استماع میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر سننے والے کو زیر سماعت گفتگو کے بارے میں پہلے سے معلوم ہو تو بھی وہ درمیان کلام میں یہ کہتے ہوئے مداخلت نہ کرے کہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ یہ آدابِ گفتگو کے خلاف ہے، جیسا کہ عطاء بن رباح سے منقول ہے:

قال عطاء بن ابی رباح: انّ الشاب ليحدثني بحديث فأستمع له كاني لم اسمعه ولقد سمعته قبل أن يولد[18]۔

عطاء ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ نوجوان کبھی کبھی مجھ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو مجھے پہلے سے معلوم ہوتی ہیں مگر میں ان کو اس طرح سنتا ہوں جیسے کبھی سنا ہی نہ ہو جب کہ ان کی ولادت سے پہلے ہی ان باتوں کو سُن چکا ہوتا ہوں۔

اسی بات کو خطیب البغدادی نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

ولا تشارک فی الحدیث أهله وان عرفت فرعه واصله[19]

(بات کرنے والے کی بات میں مداخلت نہ کرو، گرچہ تم اس کے اصل وفرع سے پہلے سے واقف ہو۔)

یہ بھی حسنِ ادب میں سے ہے کہ اگر سننے والے کو کوئی بات گراں گزرے یا اسے کسی بات پر اشکال ہو تو وہ بات مکمل ہونے تک صبر وسکون سے سنتا رہے اور جب کہنے والا اپنی بات پوری کرلے تب اس سے بہت ہی ادب اور سلیقہ سے اپنے اشکالات دور کرلے۔ گفتگو کے دوران قطع کلام نہ کرے کیوں کہ یہ آدابِ سماع کے خلاف ہے۔ الا یہ کہ تعلیم وتعلم کی مجلس ہو تو پھر صورت حال دوسری ہوگی۔ وہاں تو ہر جملہ اور ہر بات پر سوال وجواب ہوگا، مذاکرہ ومناقشہ ہوگا تب یہ بھی ادب واحترام کے دائرہ میں ہوگا[20]۔

تواضع وانکساری

گفتگو کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ گفتگو کرنے والا اپنے اہل وعیال اوراپنے خاندان کے کارناموں کو نہ بیان کرے، کیوں کہ ایسا کرنے والے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ اچھی وپُر اثر گفتگو کی شرطوں کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ کہ جو گفتگو خودستائی پر مبنی ہواس کا اثر منفی ہوگا اور لوگ ایسی گفتگو سے بے رغبت ہو جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی پاک بازی کا تذکرہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَلَا تُـزَكُّـوا أَنـفُسَـكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى (النجم ۳۲/۵۳)

تو اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ، وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا۔

ابن کثیرؒ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

أی لا تمد حوها وتشكروها وتمنُّوا بأعمالكم[۲۱]

یعنی تم لوگ خود اپنی تعریف نہ کرو، اپنا شکریہ نہ ادا کرو اور نہ اپنے کاموں کا احسان جتاؤ۔

اور یہ بات اہل ایمان بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ ان کی پیدائش سے موت تک کے احوال سے پوری طرح باخبر ہے، تو پھر خود نمائی یا فخر وغرور سے اپنی پاک بازی کا تذکرہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اور کوئی کسی سے یہ نہ کہے کہ میں تم سے بہتر ہوں یا یہ کہ میں تم سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں، کیوں کہ یہ سارے معاملات اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہیں اور کسی کے بس کا نہیں ہے کہ وہ اپنی نجات یا انجام کار کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہے، کیوں کہ انجام کار سے اللہ کے سوا کوئی بھی واقف نہیں ہے[۲۲]۔

اسی لیے قرآن مجید نے ان لوگوں کا تذکرہ کرتے وقت صیغۂ تعجب کا استعمال کیا ہے جو اپنے آپ کو بہت نیک اور صالح سمجھتے ہیں اور اپنی پاک بازی کے تذکرے کرتے پھرتے ہیں گویا انھوں نے رضائے الٰہی کی ضمانت لے رکھی ہو اور ان کو اپنی کامیابی پر یقین واطمینان ہے یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے جنت میں داخلہ کا پروانہ حاصل کر چکے ہوں۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُزَكُّونَ أَنفُسَهُمْ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا (النساء۴/۴۹)

ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں، بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے بھی دوسروں پر برتری جتانے اور فخر کرنے سے منع فرمایا:

فقال: إن الله اوحى اليّ ان تواضعوا حتى لا يفخر احد على احد، ولا يبغي احد على احد[۲۳]۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اور خاکساری اختیار کرو، کوئی کسی پر برتری نہ جتائے اور نہ زیادتی کرے۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ خود پسند کو پسند نہیں کرتا ہے بلکہ ایسے شخص کو اس جاہل کے درجہ میں رکھتا ہے جو بات کرنے والے کو سکھانا چاہتا ہو۔ ایسے شخص کو بھی ناپسند کیا جاتا ہے جس کی گفتگو کا آدھا حصہ اپنے آباء و اجداد پر فخر کرنے اور دوسروں پر برتری جتانے پر مبنی ہو۔ خود ستائی بسا اوقات شخصیت میں کسی نہ کسی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے اور کبھی لوگوں میں ممتاز ہونے کی خواہش اس کی محرک ہوتی ہے۔ باصلاحیت کو اپنی صلاحیت کے تذکرے کی ضرورت ہوتی نہیں، اس لیے اپنے اجداد کے کارناموں کا تذکرہ کرکے سامعین کو گراں بار کرنا ادب کے منافی ہے۔

گفتگو کرنے والے کا احترام اور اس سے محبت

فکری اختلاف کے باوجود انسان کی تکریم اور انسانیت کا احترام حسنِ ادب کا تقاضا ہے۔ اس تعلق سے چند ضروری باتیں درج کی جارہی ہیں[۲۴]۔

☆ گفتگو کرنے والے کو چاہیے کہ سننے والے کا پورا پورا خیال رکھے۔ گفتگو کے دوران نہ تو کسی اور شخص کی طرف متوجہ ہو اور نہ ہی موضوع سے دور ہو۔

☆ سامع کی تحقیر اور اس کی ذاتی اور خاندانی زندگی کے متعلق نقد و تبصرہ سے احتراز کرے۔

☆ سامع کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا پورا موقع فراہم کیا جائے، تاکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کا اچھی طرح دفاع کرسکے۔

گفتگو کرنے والے کو سامع کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال کرنے چاہیے کہ اس کے دل میں قبول کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے اور وہ اسے متاثر بھی کر سکے۔ مثلاً اس کو اس نام سے پکارے جو اس کو محبوب ہو یا اس صفت کے ذریعہ پکارے جو اسے پسند ہو۔ جس طرح کہ وہ اپنے بیٹے کو ''اے پیارے بیٹے'' یا اپنے والد کو ''اے ابو جان'' یا اپنی قوم کے لوگوں کو ''یا قوم'' اے میری قوم کے لوگو! وغیرہا جیسے محبت بھرے الفاظ سے پکارتا ہے۔

حضرت موسیٰ نے فرعون سے گفتگو کرتے ہوئے جو اسلوب اختیار کیا وہ ملاحظہ ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

وَقَالَ مُوسَى يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعٰلَمِينَ (اعراف ۱۰۴/۷)	اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون: میں خداوند عالم کا فرستادہ ہوں۔

اس خطاب میں ہماری نظر سب سے پہلے جس چیز کی طرف جاتی ہے وہ حضرت موسیٰ کا فرعون سے تخاطب کا انداز ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو یا فرعون! کہہ کر مخاطب کیا جو اسے اپنے ناموں میں سب سے زیادہ پسند تھا۔ یہ وہ نام تھا جس سے فرعون کی قوت وعظمت معلوم ہوتی تھی اور اس میں اس کی تنقیص نہیں تھی۔ موسیٰ نے بظاہر ایسا اس کی نفس کی رعایت کے لیے کہا۔

بالکل یہی انداز تخاطب ہمیں نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی گفتگو میں ملتا ہے۔ زعماءِ قوم کو آپ ﷺ اسی انداز سے مخاطب کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے روم کے بادشاہ کو خط لکھا تو اسے ''عظیم الروم'' کے نام سے مخاطب کیا ۲۵۔ ابن ہشام میں ایک روایت ہے:

روى عن النبي ﷺ انه كان بالموسم بمنى، يعرض نفسه على القبائل، فجاء الى بطن منهم يقال لهم بنو عبدالله، فدعاهم الىٰ الله وعرض عليهم نفسه، حتى أنه ليقول لهم ''يا بني عبدالله'' إن الله عز و جل قد احسن اسم ابيكم ۲۶۔	نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ موسم حج میں منیٰ میں قبائل کے درمیان اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ قبیلوں میں سے ایک قبیلہ وہ بھی تھا جسے بنو عبداللہ کہا جاتا تھا۔ آپ ﷺ دعوت الی اللہ دینے ان کے پاس پہنچے تو اس طور پر ان سے مخاطب ہوئے ''اے عبداللہ کے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کا کیا خوب نام رکھا ہے''۔

ان کو اس طرح سے مخاطب کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ آپ کی گفتگو کی طرف مائل ہو جائیں اور اس میں اصول سے انحراف نہیں ہے بلکہ یہ گفتگو کے آداب میں سے ہے اور دوسروں سے میل جول کا طریقہ ہے۔

عقلی اور منطقی اسلوب کا استعمال

گفتگو کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقل کے مطابق اور آسان و بنیادی منطقی اصولوں پر مبنی ہو۔ چاہے کسی رائے اور فکر کے بارے میں دلائل فراہم کرنا ہو یا مخاطب کی باتوں کو قبولیت دینی ہو۔ گفتگو ہمیشہ سنجیدہ انداز اور قوی دلائل کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوگا کہ ہمیں قرآن مجید میں مکالمہ و مباحثہ کسی خارجی اثر (مثلاً وحی و نبوت) کے زور کے بغیر پوری طرح عقل و منطق پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس بات میں شبہ نہیں کہ جو گفتگو واضح اور مضبوط دلائل کی بنیاد پر کی جاتی تو اس سے اظہار رائے کی آزادی کو تقویت ملتی ہے اور اس طرح کی گفتگو تعصب و جانب داری سے پاک ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کس طور پر ہم کلام ہوئے ملاحظہ ہو:

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي

(البقرۃ ۲/۲۶۰)

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے دکھا دے مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ جواب دیا ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔

اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ عقلی یا منطقی پیرایہ میں مکالمت کرتے ہیں اور عقل کے علاوہ گفتگو میں اثر انداز ہونے والے دوسرے عوامل سے قطع نظر کر لیتے ہیں[۲۷]۔

نوحؑ کے قصہ میں آدابِ مکالمہ و مباحثہ کے نمونے

حضرت نوحؑ کا تذکرہ ان کی قوم کے حوالے سے قرآن مجید کی متعدد سورتوں

میں بیان ہوا ہے مثلاً سورہ اعراف، یونس، ہود، مومنون، شعراء اور نوح۔ چونکہ ہمارے اس مضمون کا تعلق قرآنی قصوں کے تحلیل و تجزیہ سے نہیں بلکہ نوحؑ اور ان کی قوم سے ہونے والی گفتگو کے ادبی پہلوؤں سے ہے، چنانچہ یہاں قصہ نوحؑ کے صرف ادبی پہلوؤں سے بحث کی جائے گی۔ اور اسی سلسلے میں سورہ ھود کی ان آیتوں پر اکتفا کیا جائے گا جن سے مکالمہ و مباحثہ کے اصول و آداب اچھی طرح واضح ہوتے ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولقد أرسلنا نوحاً إلى قومه إني لكم نذير مبين. أن لا تعبدوا إلا الله إني أخاف عليكم عذاب يوم أليم. فقال الملأ الذين كفروا من قومه ما نراك إلا بشراً مثلنا وما نراك اتبعك إلا الذين هم أراذلنا بادي الرأي وما نرى لكم علينا من فضل بل نظنكم كذبين. قال يا قوم أرأيتم إن كنت على بينة من ربي وآتاني رحمة من عنده فعميت عليكم أنلزمكموها وأنتم لها كرهون. ويا قوم لا أسألكم عليه مالاً إن أجري إلا على الله وما أنا بطارد الذين آمنوا إنهم ملقو ربهم ولكني أراكم قوماً تجهلون. ويا قوم من ينصرني من الله إن طردتهم أفلا تذكرون. ولا أقول لكم عندي خزآئن الله ولا أعلم الغيب ولا أقول إني ملك ولا أقول للذين تزدري أعينكم لن يؤتيهم الله خيراً الله أعلم بما في أنفسهم إني إذاً لمن الظلمين. قالوا يا نوح قد جادلتنا فأكثرت جدالنا فأتنا بما تعدنا إن كنت من الصدقين. قال إنما يأتيكم به الله إن شاء وما أنتم بمعجزين. ولا ينفعكم نصحي إن أردت أن أنصح لكم إن كان الله يريد أن يغويكم هو ربكم وإليه ترجعون. أم يقولون افتراه قل إن افتريته فعلي إجرامي وأنا بريء مما تجرمون. وأوحي إلى نوح أنه لن يؤمن من قومك إلا من قد آمن فلا تبتئس بما كانوا يفعلون. واصنع الفلك بأعيننا ووحينا ولا

تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا إِنَّهُم مُّغْرَقُوْنَ. وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوْا مِنْهُ قَالَ إِن تَسْخَرُوْا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ. فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَن يَأْتِيْهِ عَذَابٌ يُخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ. حَتَّى إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِن كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيْلٌ (سورہ ھود ۱۱/۲۵-۴۰)

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے ان کو آگاہ کیا کہ میں تمہارے لیے ایک نذیر مبین ہوں کہ اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو۔ میں تم پر ایک دردناک عذاب کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ اس کی قوم کے ان سربراہوں نے جنھوں نے کفر کیا جواب دیا کہ ہم تو تم کو بس اپنا ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور تمہاری پیروی کرنے والوں میں انہی کو پاتے ہیں جو ہمارے مابین ذلیل لوگ ہیں، بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں اور ہم تم لوگوں کے لیے اپنے مقابل کوئی خاص امتیاز بھی نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ ہم تو تم کو بالکل جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے مجھے اپنی خاص رحمت سے بھی نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو پھر تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بیزار بھی ہو! اور اے میرے ہم قومو! میں اس خدمت پر تم سے کسی مال کا طالب نہیں، میرا اجر تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔ اور اے میرے ہم قومو! اگر میں ان کو دھتکار دوں تو خدا کے مقابلے میں کون میری مدد کرے گا؟ کیا تم لوگ اس پہلو پر دھیان نہیں کرتے؟ اور میں تمہارے سامنے یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں

غیب جانتا ہوں۔ اور نہ یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں اور نہ میں ان لوگوں کے بارے میں جن کو تمہاری نگاہیں حقیر دیکھتی ہیں، یہ کہہ سکتا کہ اللہ ان کو کوئی خیر دے ہی نہیں سکتا۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کروں تو میں ہی ظالم ٹھہروں گا۔ وہ بولے کہ اے نوح تم نے ہم سے بحث کرلی اور بہت بحث کرلی اگر تم سچے ہو تو وہ چیز ہم پر لاؤ جس کی تم ہم کو برابر دھمکی سنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ اس کو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے گا اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے اور میری خیر خواہی تم پر کچھ کارگر نہیں ہوسکتی، اگر میں تمہاری خیر خواہی کرنا چاہوں، اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہو، وہی تمہارا رب ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا ہے۔ کیا یہ کہتے ہیں اس نے اس کو گھڑ لیا ہے، کہہ دو کہ اگر میں نے اس کو گھڑا ہے تو میرے جرم کا وبال میرے ہی اوپر ہے اور جو جرم تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔

اور نوح کو وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں سے جو ایمان لا چکے ان کے سوا اب کوئی اور ایمان لانے والا نہیں تو جو کچھ یہ کرتے ہیں اس سے آزردہ خاطر نہ ہو اور تم کشتی بناؤ ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے مطابق اور ان ظالموں کے باب میں اب ہم سے کچھ نہ کہیو، یہ تو غرق ہو کر رہیں گے۔ اور وہ کشتی بنانے لگا اور جب جب اس کی قوم کے بڑوں کی کوئی جماعت اس کے پاس سے گزرتی تو اس کا مذاق اڑاتی۔ وہ ان کو جواب دیتا کہ اگر تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو تو جس طرح تم مذاق اڑا رہے ہو اسی طرح ہم بھی تمہارا مذاق اڑائیں گے تم جلد جان لوگے کہ وہ کون ہیں جن پر وہ عذاب آتا ہے جو ان کو رسوا کر کے رکھ دیتا ہے اور وہ قہر نازل ہوتا ہے جو ٹالے نہیں ٹلتا، یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور طوفان ابل پڑا، ہم نے اس سے کہا کہ ہر چیز سے نر و مادہ دونوں کو اور اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے۔ اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔

ان آیات کا بغور مطالعہ کرنے سے حضرت نوحؑ کی گفتگو کے چند ادبی پہلو

ہمارے سامنے آتے ہیں، جنھیں ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔ یہ کل آٹھ نکات پر مبنی ہیں جن میں سے ابتدائی تین کا تعلق حضرت نوحؑ کے طریقۂ گفتگو سے اور باقی پانچ کا ان کے اسلوبِ بیان اور طرزِ ادا سے ہے۔

اسلوبِ کلام جسے حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت میں اختیار کیا

۱۔ تمہید

حضرت نوح علیہ السلام متعلقہ موضوع پر گفتگو کے لیے بہت ہی واضح وموثر انداز پر تمہید قائم کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دل ان کی باتوں کو سننے کے لیے پوری طرح تیار ہو جائیں۔ مثلاً آپ اپنی گفتگو کا آغاز ان الفاظ کے ساتھ کرتے ہیں (انی لکم نذیر مبین) ۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ اسلوب بلیغ سے گفتگو کا آغاز بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے جس سے لوگوں کے قلب ونظر موضوع کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

۲۔ مرکزی موضوع

تمہید کے بعد موضوع کی اہمیت آسان اور واضح الفاظ میں پیش کی جائے۔ اس میں کسی طرح کا غموض وابہام نہ پایا جائے تاکہ ہر سطح کے افراد اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔ حضرت نوحؑ نے یہی طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے موضوع کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جو معنیٰ ومراد کو بالکل واضح کردے یہاں تک کہ سامعین کی توجہ اس پر مرکوز ہو جائے اور کسی تاویل کی بھی گنجائش باقی نہ رہے۔ انھوں نے اپنے پیغام کا خلاصہ ان مختصر الفاظ میں پیش کردیا۔ (أن لاّ تعبدوا الا اللہ رھود ۱۱/ ۲۶)

خاتمہ

مرکزی موضوع کی وضاحت کے فوراً بعد متوقع نتائج کا ذکر اس طور پر کیا کہ اگر لوگ سابقہ روش پر قائم رہتے ہیں تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ حضرت نوحؑ کی گفتگو میں یہ خلاصۂ کلام تہدید وانذار کے انداز میں ہے (انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم رھود

۲۶/۱۱) اس طرح ان کے دل خوف سے بھر گئے اور وہ راہ فرار اختیار نہ کر سکے۔ ان کو خوف دلانے میں نوحؑ نے جو ادبی پہلو ملحوظ رکھا ہے وہ بھی مخفی نہیں۔ آپ کا انھیں عذاب الٰہی سے خوف دلانا اور اللہ کی طرف بلانا اس محبت کے تقاضے سے تھا جس کے سبب آپ نے ان کے سامنے اپنے خوف کا اظہار بالکل اس شخص کی طرح کیا جو یہ دیکھ کر گھبرا گیا ہو کہ اس کا محبوب تباہ کن راستہ پر چل رہا ہے۔

حضرت نوحؑ کا انداز گفتگو

تمہید کے بعد حضرت نوحؑ اپنی قوم کے سامنے اپنی دعوت کے خاص نکات تفصیل سے پیش کرتے ہیں اور ان کے شبہات وسوالات کا جواب دیتے ہیں۔ اس مکالمہ ومباحثہ کا بغور مطالعہ کرنے والا حضرت نوحؑ کی گفتگو میں درج ذیل اصول وآداب کو بہت نمایاں طور سے محسوس کرے گا۔

قوم یا مخاطب سے حد درجہ محبت کا اظہار

حضرت نوحؑ نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ ان کی گفتگو میں کوئی ایسی بات نہ آجائے جو ان کی قوم کی ان سے دوری اور نفرت کی وجہ بن جائے۔ اس سے قطع نظر کہ قوم کے لوگ ان کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کریں۔ دراصل اپنی گفتگو کو کامیاب وموثر بنانے کا یہی طریقہ ہے اور یہ کامیابی دلوں کے جیتنے کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنی بات کا آغاز ''یا قوم'' اے میرے ہم قومو! جیسے الفاظ سے کرتے ہوئے انھیں اس تعلق اور ربط کی طرف متوجہ کیا جو انھیں جوڑنے والا ہے اور ضمناً یہ بات بھی یاد دلا دی کہ کوئی بھی شخص عام حالات میں اپنی قوم کو دھوکہ نہیں دیتا اور نہ ہی انھیں گمراہ کرتا ہے۔ اس طرح آپ نے ان کے اعتماد میں مزید پختگی لانے کی کوشش کی ۲۸۔

سوالیہ جملوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں تفکر وتجسس پیدا کرنا

حضرت نوحؑ اپنی گفتگو میں سوالیہ جملوں کے ذریعہ اپنی قوم کے اندر غور وفکر کا

داعیہ پیدا کرتے جیسا کہ درج ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے:

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ (ھود ۲۸/۱۱)

اس نے کہا، اے میرے ہم قومو! بتاؤ اگر میں اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں اور پھر اس نے خاص اپنی رحمت سے بھی نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہی تو کیا ہم اس کو پھر تم پر چپکا دیں جب کہ تم اس سے بے زار بھی ہو!

أرأیتم کے معنیٰ یہاں مجھے بتاؤ، یا باخبر کرو کے معنیٰ میں ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے[۲۹]۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے ان کی توجہ کلام کی طرف سے ہٹادی، پھر بھی انھوں نے ان کے ساتھ نرمی اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا۔ گویا کہ آپ ان سے کہہ رہے ہوں کہ چلو فرض کرلو کہ میرا پیغام اور میری رسالت جس کے ذریعہ اللہ نے مجھے عزت بخشی ہے بالکل واضح ہے لیکن یہ تم سے پوشیدہ ہے جس کا ادراک تم لوگوں کو نہیں ہے۔ تو کیا میں تمھیں اس کے قبول کرنے پر مجبور کررہا ہوں۔ یہ بات پوری طرح ان کے دلی اطمینان کے لیے ہے جو انھیں دین میں اختیار کی آزادی دے سکے جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ مذکور ہے: لااکراہ فی الدین (البقرۃ ۲۵۶/۲)[دین میں کوئی جبر نہیں ہے]۔

یہ چیز ان کے اطمینان میں اضافہ کا سبب ہوسکتی ہے اگر ان کے اندر ذرا بھی سوچنے سمجھنے کی استعداد ہو[۳۰]۔

۶-صیغۂ مجہول کا استعمال

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے براہ راست یہ نہیں کہا کہ تم ضلالت وگمرہی میں ہو بلکہ اس کے لیے مجہول کا صیغہ استعمال کیا اور اس طور پر ہم کلام ہوئے: (آتنی رحمۃ من عندہ، فعمیت علیکم) (اور اس نے مجھے اپنی خاص رحمت سے نوازا اور وہ تم سے پوشیدہ رہتی)۔

اس سوالیہ انداز سے حضرت نوحؑ کے اس پیغام کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جسے لے کر وہ آئے تھے۔ جس کا ادراک ہر عقل مند شخص کر سکتا ہے۔ اگر ان کی عقل پر پردہ نہ پڑا ہوتا تو وہ بھی یہ سمجھ لیتے۔ درحقیقت یہ ان سے حد درجہ محبت اور نرمی کا اظہار ہے۔ گویا آپ ان سے یہ کہہ رہے ہوں کہ میں تمھیں نبوت کے عدم ادراک سے متہم نہیں کر رہا ہوں، بلکہ اس چیز کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہوں جو تمہارے اور نبوت کے درمیان حائل ہوگئی ہے کہ تم اس کا ادراک نہیں کر سکے۔ یہ انداز نفسیاتی طور پر انھیں اس چیز میں غور و فکر کرنے کی دعوت دے رہی ہے جو ان کے درمیان حائل ہے[۳۱]۔

چاہے صیغۂ مجہول کا استعمال ہو یا گناہ گار و خطا کار کی عدم صراحت کا۔ آداب گفتگو کا یہ وہ نمایاں پہلو ہے جسے اختیار کرنا بہت مناسب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب آدمی کسی کو اس کی غلطی سے باخبر کرے تو بہت خوبصورت انداز اختیار کرے جس میں اشارہ و کنایہ کا پہلو غالب ہو نہ کہ صراحت کا۔ اس باب میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ بھی ملتا ہے۔ جب آپ ﷺ کو صحابہ کی کسی غلطی کا علم ہوتا تو آپ ﷺ ان کے نام کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرتے اور نہ ہی ان کی تشہیر کرتے تھے۔ کیوں کہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ اس سے ان کے دل و دماغ میں نفرت کے جذبات پنپنے لگیں گے اور عدم صراحت سے ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچے گی۔ اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک بار نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

مابال اقوام یرفعون ابصارھم الی السماء فی صلوتھم لینتھن عن ذلک او لتخطفن ابصارھم [۳۲]۔	ان لوگوں کا کیا معاملہ ہے جو اپنی نگاہوں کو نماز میں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔ انھیں اس سے رک جانا چاہیے ورنہ ان کی آنکھیں اچک لی جائیں گی۔

امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے یہ روایت بیان کی:

قالت: صنع رسول الله ﷺ امراً فترخص فيه، فبلغ ذلک ناسا من اصحابه فکانهم کرهو وتنزهوا عنه، فبلغه ذلک، فقام خطيباً، فقال: مابال رجال بلغهم عنی امر ترخصت فيه فکرهوه و تنزهوا عنه، فوالله لانا اعلمهم بالله اشدهم له خشية ۳۳۔

عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ایک بار کسی معاملے میں رخصت پر عمل کیا، صحابہ میں سے کچھ کو یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے ناپسند کیا اور کنارہ کشی اختیار کی، جب آپ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، ان لوگوں کا کیا معاملہ ہے جنھیں میرے رخصت پر عمل کرنے کی بات پہونچی اور انھوں نے اسے ناپسند کیا اور کنارہ کش ہو گئے۔ بخدا میں ان سے زیادہ اللہ کو جانتا ہوں اور ان سے زیادہ اس سے خوف کھاتا ہوں۔

۷- استدلالی انداز

گفتگو کے آداب میں سے یہ بھی ہے جو مسائل دلائل طلب ہوں انھیں دلیل کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔ اور استدلال میں حکمت و مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فیہ دلائل کو ترک کردیا جائے اور مبہم دلائل کو پیش کرنے سے گریز کیا جائے۔ ایسے دلائل پیش کرنے چاہیے جسے ہرکوئی آسانی سے سمجھ لے اور تسلیم کرلے۔ ایسا ہی نوحؑ نے کیا۔ آپ نے اپنی گفتگو میں ایسا منطقی طریقہ اختیار کیا جسے ان کی قوم تسلیم کررہی تھی اور وہ یہ کہ ہر عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ گویا آپ لوگوں سے کہہ رہے ہیں کہ جب میں اللہ کا رسول نہیں ہوں اور جو کچھ میں دعویٰ کررہا ہوں محض اپنے فائدہ کے لیے۔ تو کیا میں نے تم سے کبھی اپنی کوششوں یا محنت کا کوئی بدلہ مانگا؟ اس سلسلے میں آپ کو شرح صدر ہے کہ انھوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا اور ان کی قوم کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ پھر نوحؑ نے انتہائی لطف وکرم کے ساتھ بیان کیا کہ انہیں صرف اللہ کی طرف سے ملنے والے اجر کا انتظار ہے نہ کہ لوگوں کا۔ فرماتے ہیں: وَيَا قَوْمِ لا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالاً إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللّهِ ۳۴۔

قوم کے سوالوں کا جواب

دوسروں کے ساتھ گفتگو کرنے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ ان کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اسے اس کی کمزوری، موضوع سے عدم واقفیت یا پھر سامع سے بے توجہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے جواب دینا بڑی اہمیت رکھتا ہے خاص کر جب اس میں کوئی فائدہ مضمر ہو یا کسی معاملہ میں اپنا موقف ثابت کرنا ہو، لیکن اس موقع پر بھی مخاطب کی جارحیت اور اشتعال انگیزی کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی برتنا اور حکمت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ سابقہ قرآنی آیات سے حضرت نوحؑ کا یہی طرز کلام یا انداز جواب سامنے آتا ہے کہ انھوں نے پوری وضاحت سے ان کے سوالات کا جواب دیا اور ان کے اشکالات حل کیے۔ جیسا کہ ذیل کی سطور سے واضح ہوتا ہے۔

نوحؑ کی قوم کے ان کے کم زور متبعین سے اظہار نفرت کے باوجود انھوں نے اس کا جواب اس انداز میں دیا کہ ان سے محبت و نرمی ظاہر ہو۔ قرآن نے ان کا جواب ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

وَمَـا أَنَاْ بِطَارِدِ الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِـمْ وَلَـكِنِّيَ أَرَاكُمْ قَوْماً تَجْهَلُونَ (هود ۲۹/۱۱)	اور میں ان لوگوں کو ہرگز دھتکارنے والا نہیں جو ایمان لاتے ہیں، یہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں بلکہ میں تو تم کو دیکھ رہا ہوں کہ تم جہالت میں مبتلا ہو۔

یعنی انھوں نے اپنی قوم سے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوت پر ایمان لانے والوں کو اپنے سے دور کر دیں، کیوں کہ ان کا مجھ پر ایمان لانا اور مجھ سے وفاداری کا رویہ ایسا کرنے سے مانع ہے۔ بالفرض اگر انھوں نے ان کے مقابلہ پر مومنین کو بھگا دیا تو روز قیامت وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں جہاں وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کریں گے۔ حضرت نوحؑ کے اس جواب میں ضمنی طور پر اپنی قوم کو

حشر ونشر اور روز قیامت کی دعوت دینا بھی شامل ہے۔ پھر انھوں نے لوگوں کے سامنے یہ بات واضح کردی کہ یہ مومنین امن پسند لوگ ہیں اور تم لوگ ظلم وزیادتی کرنے والے ہو پس تم ظالم وجابر ہوکر کیسے انھیں بھگانے کا مطالبہ کررہے ہو۔ حضرت نوحؑ پھر اس طور پر خطاب کرتے ہیں: وَيَا قَوْمِ مَن يَنصُرُنِي مِنَ اللّهِ إِن طَرَدتُّهُمْ أَفَلاَ تَذَكَّرُونَ ۔۳۵ یا پھر ان کا یہ کہنا: وَلَـكِنِّيَ أَرَاكُمْ قَوْماً تَجْهَلُونَ ۔ یہاں تجھلون کے معنی عدم علم کے نہیں ہیں جسے بہت خراب سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہاں جہالت کے معنیٰ نادانی اور بے وقوفی کی وجہ سے دوسروں پر ظلم وزیادتی کرنا ہے۔ جیسا کہ عمرو ابن کلثوم کہتا ہے۔

ألا لا يجهلن احد علينا فنجهل فوق جهل الجاهلينا۳۶

(سنو! ہمارے اوپر کوئی زیادتی نہ کرے [اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ جان لے کہ] ہم جاہلوں سے بڑھ کر جاہل ہیں۔)

اور جب ان کی قوم نے بحث ومباحثہ کے دوران یہ کہا کہ (وَمَا نَرَى لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ) ہم تو تمہارے اندر فضل وشرافت کی کوئی چیز نہیں پاتے۔ ان کے خیال کے مطابق فضل وکرامت کوئی محسوس کی جانے والی چیز ہوتی ہے، چاہے مادی ہو جیسے مال، یا روحانی ہو مثلاً علم غیب یا مافوق الفطرت کوئی چیز۔ تو حضرت نوحؑ نے ان کے اس تصور کی یہ کہہ کر تردید کی کہ میں تو تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میں رزق کے خزانوں کا مالک ہوں۔ نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتوں کو جانتا ہوں اور نہ ہی یہی دعویٰ کرتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو بس تمہاری طرح انسان ہوں۔ ہاں! اللہ نے مجھے نبوت ورسالت سے سرفراز فرمایا ہے۔ گویا آپ نے ان سے یہ کہا کہ تم لوگوں نے فضل وکرامت کا جو اصول قایم کر رکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ لہٰذا تمہارا مجھے اور مجھ پر ایمان لانے والوں کو حقیر سمجھنا غلط ہے اور تمہارا یہ رویہ اس وجہ سے ہے کہ ہم تمہارے تصور کے مطابق نہیں ہیں ۳۷۔

قرآن کریم کے بیان کردہ اس پورے مکالمہ ومباحثہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اس مکالمہ کے دوران دلائل وبراہین کے انبار لگادیے اور ان کی تمام دلیلوں کو باطل ٹھہراتے ہوئے اس کا مسکت جواب دیا یہاں تک کہ ان کے سامنے

اعتراف و اقرار کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا لیکن اس سے گریز کرتے ہوئے وہ حضرت نوحؑ کو ہی یہ کہہ کر لعنت ملامت کرنے لگے کہ تم کثیر الجدال ہو۔ جیسا کہ قرآن کریم نے بیان کیا:

قَالُوا يَا نُوحُ قَدْ جَادَلْتَنَا فَأَكْثَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (ھود۱۱/۳۲)	وہ بولے کہ اے نوح تم نے ہم سے بحث کر لی اور بہت بحث کر لی۔ اگر تم سچے ہو تو وہ چیز لاؤ جس کی تم ہم کو برابر دھمکی سنا رہے ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جاہل اور معاند ایسا ہی کرتے ہیں جب وہ جواب دینے سے عاجز ہو جاتے ہیں یعنی موعظت و نصیحت کرنے والوں کی طرف تلوار بلند کرنے لگتے ہیں، مگر ان کی یہ کٹھ حجتی اور دھمکی حضرت نوحؑ کو صحیح راستہ اختیار کرنے سے نہ روک سکی اور انھوں نے ہر بات کا جواب نہایت ادب سے نرم لہجہ میں دیا جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے:

قَالَ إِنَّمَا يَأْتِيكُم بِهِ اللَّهُ إِن شَاءَ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ. وَلَا يَنفَعُكُمْ نُصْحِيَ إِنْ أَرَدتُّ أَنْ أَنصَحَ لَكُمْ إِن كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَن يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (ھود۱۱/۳۳-۳۴)	انھوں نے جواب دیا کہ اس (عذاب الٰہی) کو تم پر اللہ ہی لائے گا اگر وہ چاہے اور تم اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکو گے اور میری خیر خواہی تم پر کچھ کارگر نہیں ہو سکتی اگر میں تمہاری خیر خواہی کرنا چاہوں اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہتا ہو، وہی تمہارا رب ہے اور اس کی طرف لوٹنا ہے۔

یعنی نوحؑ نے اپنی قوم سے انتہائی خاکساری سے کہا: اے میری قوم کے لوگو جس عذاب کے لیے تم جلدی مچائے ہوئے ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جب وہ تمہارے اوپر اسے نازل کرے گا پھر تم میں سے کوئی اس سے فرار نہ پا سکے گا۔ میں نے تمھیں خالق و مالک کی سچی اور خالص عبادت کی دعوت مختلف پیرایہ میں دی، لیکن میری نصیحت اور خیر خواہی تمہارے کچھ کام نہ آئی اور تم اپنے کفر پر مُصر رہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے

تمھیں گم کردہ راہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو میں ہرگز اس باب میں تمھارا کچھ ساتھ نہ دے سکوں گا۔ وہ بزرگ و برتر ہے، تمہارے سارے احوال و معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر واپس جانا ہے اور وہی تمہارے اعمال کا حساب وکتاب لے گا ۳۸۔ حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے اس مباحثہ سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوتی ہے کہ انھوں نے ان کے ساتھ اپنی گفتگو اور بحث ومباحثہ میں ادب، جراءت، صبر وتحمل، حکمت بھرے کلام، واضح اور روشن دلیل پیش کرنے اور اپنے خالق کی جناب میں نہایت عاجزی سے دعا کرنے جیسے طریقے اختیار کیے لیکن ان کی کافر قوم کے رہنماؤں نے اپنی گفتگو میں کبھی جھوٹ، کبھی پاگل پن، کبھی کٹھ حجتی، کبھی بے راہ روی اور کبھی اپنی برتری جتانے کا رویہ اپنایا اور مزید یہ کہ حضرت نوحؑ اور ان کو ماننے والے کم زور لوگوں کو ڈرایا دھمکایا۔

عقل مندوں کی گفتگو اسی طرح مناسب انداز، بلند اسلوبِ بیان اور واضح و روشن دلائل کے ساتھ ہوتی ہے اور بے وقوفوں کی گفتگو غرور و گھمنڈ، سوءظن، دھمکی اور وعید کے بل بوتے پر۔ اس سلسلہ میں حضرت نوحؑ نے ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ چھوڑا ہے جس کی ہمیں اپنی روزمرہ کی گفتگو اور بحث ومباحثہ کی مجلسوں میں پیروی کرنی چاہیے۔

خاتمہ

آخر میں بطور خلاصہ کلام کے چند نکات پیش کیے جارہے ہیں:

۱- قرآن کریم نے گفتگو و مباحثہ کے آداب کو بڑی اہمیت دی ہے کہ گفتگو میٹھی اور نرم زبان میں ہو۔ فساد وطول بیانی سے پاک ہو تاکہ مطلوبہ مقاصد حاصل ہوسکیں۔

۲- قصص قرآنی میں آدابِ گفتگو کے عمدہ وزندہ نمونے موجود ہیں، کیوں کہ انبیاء کرام کے اپنی قوم کے ساتھ مباحثے پوری وضاحت کے ساتھ ان کے مودبانہ طرزِ کلام کا پتہ دیتے ہیں۔ اکثر قوموں کا رویہ اپنے انبیاء کے تئیں سوءادب پر ہی دلالت کرتا ہے۔

۳- حضرت نوحؑ کا ادب اپنی قوم سے گفتگو کے دوران ہی واضح ہوتا ہے۔ اپنی قوم سے ان کے طریقِ مباحثہ اور طرز گفتگو کا پتہ چلتا ہے، نیز یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت

نوحؑ اپنی قوم سے کس قدر الفت ومحبت رکھتے تھے اور بھلائی کے خواہاں تھے۔ انھوں نے دلائل اور استفہامیہ انداز کلام سے ان کی عقلوں کے بند دروازوں کو کھولا۔ ان پر براہ راست گمرہی کا الزام عائد نہیں کیا بلکہ صیغۂ مجہول کا استعمال کیا یعنی ان پر طنز و تشنیع بھی نہیں کیا، بلکہ ان کے سوالوں کا حکمت ونرمی سے جواب دیا۔

۴- حضرت نوحؑ نے گفتگو کا ایسا نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے جسے اپنے مخالفین سے گفتگو کرتے وقت اختیار کرنا چاہیے۔

حواشی و مراجع

۱ عبدالستار الہیتی، الحوار: الذات والآخر، وزارۃ اوقاف والشوؤن الاسلامیہ، دوحہ، ۲۰۰۴ء، ص۴۰

۲ ملاحظہ کریں: محمد حسین فضل اللہ، الحوار فی القرآن، دارالملاک، بیروت، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء، ص۵۵-۵۶

۳ دیکھیے: عبدالحلیم حفنی، اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، مصر، ۱۹۸۵ء، ص۱۶-۱۷

۴ اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، محولہ بالا

۵ ابوعبداللہ احمد بن ابی بکر بن فرح القرطبی، الجامع الاحکام القرآن، تحقیق: احمد عبدالحلیم البردونی، دارالشعب، القاہرۃ، ۱۳۷۲ھ، ۳/۲۸۶

۶ اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، ص۲۷-۲۸

۷ راشد علی عیسی، مہارات الاتصال، طبعۃ وزارۃ الشؤون والاوقاف الاسلامیہ، دوحہ، ۲۰۰۴ء، ص۹۷-۹۸

۸ غازی صحی آقبیق، آیات قرآنیہ: ومضات من القرآن الکریم، دارالفکر دمشق، ۲/۹۹

۹ اسماعیل بن عمر ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، دارالفکر، بیروت، ۱۴۰۱ھ، ۳/۴۶

۱۰ دیکھیے محمد حسین فضل اللہ، تفسیر من وحی القرآن، دارالملاک، بیروت، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء، ۲/ ۱۱۴-۱۱۵

۱۱ محمد بن ابی بکر القیم الدمشقی، اعلام الموقعین عن رب العالمین، تحقیق: طٰہ عبدالروؤف سعد، دارالجیل، بیروت، ۱۹۷۳ء، ۳/ ۸۳-۸۸

۱۲ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، السنن، تحقیق: احمد محمود شاکر وآخرون، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۴/ ٦٦٠ (کتاب صفة القیامة والرقائق والورع، باب ۴۸)

۱۳ احمد بن محمد ابن الاندلسی، العقد الفرید، تحقیق: مفید محمد قمیحۃ، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، بدون تاریخ، ۲/ ۳۰۲

۱۴ محمد بن ادریس الشافعی، دیوان الامام الشافعی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۰۴ھ/ ۱۹۸۴ء، ص ٦۳

۱۵ احمد بن محمد ابن عبدربہ الاندلسی، تادیب الناشئین بادب الدنیا والدین، تحقیق: محمد ابراہیم سلیم، مکتبہ القرآن، قاہرہ، ص ۲۷

۱٦ ولیام اوری، فن التفاوض، ترجمہ: نیفین عزاب، دارالعربیۃ للنشر والتوزیع، القاہرہ، ۱۹۹۴ء، ص ٦۷-٦۸

۱۷ ابومحمد عبدالملک بن ہشام بن ایوب الحمیری، السیرة النبویہ، تحقیق طٰہ عبدالروؤف سعد، دارالجیل، بیروت، ۱۴۱۱ھ، ۲/ ۱۳۰-۱۳۱

۱۸ ابن مفلح المقدسی: الآداب الشرعیة والمنح المرعیة، ۲/ ۱۱۸

۱۹ حوالۂ مذکور، ۲/ ۱۹۹

۲۰ دیکھیے عبدالفتاح ابوغدۃ، من ادب الاسلام، دارالبشائر الاسلامیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ، ص ٦۵

۲۱ تفسیر ابن کثیر، محولہ بالا، ۴/ ۲۵۸

۲۲ دیکھیے فخر الدین محمد بن محمد الرازی، مفاتیح الغیب، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲٦/ ۱۵

۲۳ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب اثبات

عذاب القبر و التعوذ منه

۲۴ دیکھیے: عبدالکریم الشیخلی، اخلاقیات الحوار، دارالشروق، عمان، ۱۹۹۳ء، ص ۶۹-۷۰

۲۵ البخاری، الجامع الصحیح، کتاب بدء الوحی (باب ٦)

۲٦ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ۲/۲۷۱، ابوجعفر محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم و الملوک، دارالکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۰۷ھ، ۱/۵۵٦

۲۷ عبدالستار الہیتی، الحوار: الذات و الآخر، ص ۵۸-۵۹

۲۸ دیکھیے: عبدالحلیم حفنی، اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، ص ۷۷

۲۹ دیکھیے: ابوالسعود محمد بن محمد العمادی، ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۴/۲۲۱

۳۰ عبدالحلیم حفنی، اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، ص ۷۷-۷۸

۳۱ حوالہ مذکور، ص ۷۸

۳۲ الجامع الصحیح للبخاری، کتاب الاذان، باب رفع البصر الی السماء فی الصلوٰۃ

۳۳ مسلم بن حجاج القشیری، الجامع الصحیح، کتاب الفضائل، باب فی اسماءہ ﷺ

۳۴ عبدالحلیم حفنی، اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، ص ۷۸-۷۹

۳۵ حوالۂ مذکور، ص ۷۸-۷۹

۳٦ الجهل کے معنی و مفہوم کے لیے دیکھیے: ابوالفضل محمد الآلوسی، روح المعانی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۲/۴۲

۳۷ اسلوب المحاورۃ فی القرآن الکریم، محولہ بالا، ص ۸۱؛ سید محمد طنطاوی، ادب الحوار فی الاسلام، دارنهضة للطباعة والنشر والتوزیع، مصر، ۱۹۹۷ء، ص ۱۴۳

۳۸ حوالہ مذکور، ص ۱۴۳-۱۴۴

(الدراسات الاسلامیہ (اسلام آباد)، ۴۴/۱، جنوری - مارچ ۲۰۰۹ء، ص ۲۰۹-۲۲٦)